© rasailojaraid.com

مبتلا رہے۔ اور اس صورت میں سوسائٹی کے لیے بھی وہ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی ذات سے ایک مستقل فتنہ لوگوں کے درمیان پھیلتا رہے گا اور دوسرے صحیح و سالم اعضا میں بھی اس کے زہر کے سرایت کرنے کا اندیشہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے موت کی سزا دے کر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔

قتل مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلوّن کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں اور جن کی رائے اور سیرت میں وہ استحکام سرے سے موجود ہی نہیں ہے جو ایک نظامِ زندگی کی تعمیر کے لیے مطلوب ہوتا ہے۔ کسی نظامِ زندگی کی تعمیر ایک نہایت سنجیدہ کام ہے، جو جماعت اس کام کے لیے اٹھے اس میں لہری طبیعت کے کھلنڈرے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، اس کو صرف ان لوگوں سے مرکب ہونا چاہیے جو واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس نظام کو قبول کریں اور جب قبول کر لیں تو دل و جان سے اس کے قیام اور اس کی تعمیر میں لگ جائیں۔ لہٰذا یہ عین حکمت و دانش ہے کہ ہر اس شخص کو جو اس جماعت کے اندر آنا چاہے، پہلے ہی مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے، تاکہ وہ داخل ہونے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ آیا اسے ایسی جماعت میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس طرح جماعت میں آئے گا ہی وہ جسے کبھی باہر جانا نہ ہوگا۔

تیسرے نمبر پر جو اعتراض ہم نے نقل کیا ہے اس کی بنیاد بھی غلط ہے۔ معترضین کے پیش نظر دراصل ان "مذاہب" اور ان کے پرچار کا معاملہ ہے جن کی تعریف ہم ابتدا میں کر چکے ہیں۔ ایسے مذاہب کو وہ اتنا ہی پیادر دروازہ آنے اور جانے والوں کے لیے کھلا رکھنا چاہیے۔ وہ اگر جانے والوں کے لیے اسے بند کر دیں گے تو ایک بے جا حرکت کریں گے۔ لیکن جس مذہب فکر و عمل پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر کی گئی ہو اسے کوئی معقول آدمی، جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو، یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی تخریب اور اپنے اجزائے ترکیب کے انتشار اور اپنی بندشِ وجود کی برہمی کا دروازہ خود ہی کھلا رکھے۔ منظم سوسائٹی اور اسٹیٹ، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا بنانا اور بگاڑنا ہمیشہ ہی سے جان جوکھوں کا کام رہا ہے اور اپنی عین فطرت کے لحاظ سے یہ کام ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کی امید ہے کہ آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر کسی نظامِ زندگی کو تبدیل کر دیا جائے۔ کسی مزاحمت کے بغیر خود تبدیل ہونے کے لیے صرف وہی نظامِ زندگی تیار ہو سکتا ہے جس کی جڑیں گل چکی ہوں اور جس کی بنیادوں میں اپنے استحقاقِ وجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وبقا کا یقین باقی نہ رہا ہو۔

رہا تناقض کا اعتراض تو اوپر کی بحث کو بغور پڑھنے سے بڑی حد تک وہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لیے مجبور نہیں کرتے، اور واقعی ہماری روش یہی ہے، مگر جسے آکر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لیے کھلا ہوا نہیں ہے لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ کوئی بتائے کہ آخر اس میں تناقض کیا ہے؟ بلاشبہ ہم نفاق کی مذمت کرتے ہیں اور اپنی جماعت میں ہر شخص کو صادق الایمان دیکھنا چاہتے ہیں، مگر جس شخص نے اپنی حماقت سے خود اس دروازے میں قدم رکھا جس کے متعلق اُسے معلوم تھا کہ وہ جانے کے لیے کھُلا ہوا نہیں ہے وہ اگر نفاق کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اس کو اس حالت سے نکالنے کے لیے ہم اپنے نظام کی برہمی کا دروازہ نہیں کھول سکتے۔ وہ اگر ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر نہیں رہنا چاہتا بلکہ جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لیے کیوں نہیں پیش کرتا؟ ہاں یہ اعتراض بظاہر کچھ وزن رکھتا ہے کہ اسلام جب خود اپنے پیروؤں کو تبدیل مذہب پر سزا دیتا ہے اور اُسے قابلِ مذمت نہیں سمجھتا تو دوسرے مذاہب کے پیرو اگر اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے پر سزا دیتے ہیں تو وہ ان کی مذمت کیوں کرتا ہے۔ لیکن ان دو رویوں میں بظاہر جتنا تناقض نظر آتا ہے فی الواقع وہ نہیں ہے، بلکہ اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی رویہ اختیار کیا جاتا تو البتہ تناقض ہوتا۔ اسلام اپنے آپ کو حق کہتا اور بالکل خلوص کے ساتھ حق ہی سمجھتا ہے اس لیے وہ حق کی طرف آنے والے اور حق سے منہ موڑ کر واپس جانے والے کو مساوی مرتبہ پر ہرگز نہیں رکھ سکتا۔ حق کی طرف آنے والے کے لیے یہ حق ہے کہ اس کی طرف آئے اور جو اس کی راہ میں مزاحمت کرتا ہے وہ مذمت کا مستحق ہے۔ اور حق سے واپس جانے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ اس سے واپس جائے اور جو اس کی راہ روکتا ہے وہ مذمت کا مستحق نہیں ہے۔ تناقض اس رویہ میں نہیں ہے، البتہ اگر اسلام اپنے آپ کو حق بھی کہتا اور پھر ساتھ ہی اپنی طرف آنے والے اور اپنے سے منہ موڑ کر جانے والے کو ایک ہی مرتبہ میں رکھتا تو بلاشبہ یہ ایک متناقض طرزِ عمل ہوتا۔ (باقی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی)

(۲)

(۲) قدیم ترین زمانہ سے دنیا میں دو مقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت (اگرچہ اس میں صدہا قسم کی غلامیاں شامل ہیں)۔ دوسرے انسان کی عبدیت، اس کی خدا کے سامنے ذمہ داری و جواب دہی اور وحی و تعلیماتِ پیغمبر کی پیروی کی دعوت۔ پہلی دعوت کا نام اسلام کی وسیع اصطلاح میں جاہلیت ہے، اور دوسری دعوت خود اسلام کی ہے۔ ان دونوں دعوتوں کی دنیا کی مختلف جماعتیں اور قومیں اپنے اپنے وقت میں علمبردار رہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے دوسری دعوت (اسلام) کی امامت قیامت تک کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں کے نام لکھدی گئی، اور پہلی دعوت کی قیادت وقتاً فوقتاً دنیا کی مختلف جاہلی قومیں اور تہذیبیں کرتی رہیں یہاں تک کہ تقریباً دو سو برس سے تقدیر الٰہی نے اس کی قیادت و امامت کا فیصلہ یورپ کی عیسائی قوموں کے حق میں کیا۔ اس وقت سے مسیحی (لیکن دراصل مادّی) یورپ نے جاہلیت کی عالمگیر نمائندگی اور ایسی طاقت اور ایسے اسلحہ کے ساتھ اس کی قیادت کی کہ اس سے صدیوں پہلے ہمارے علم میں کسی قوم نے نہیں کی تھی۔ طبعی طور پر زندگی کے ہر شعبہ اور متمدن دنیا کے تقریباً ہر میدان میں ان دونوں مقابل دعوتوں اور قوموں کے نمائندوں اور علمبرداروں کا تصادم پیش آیا۔ لیکن مختلف علمی، ذہنی اور سیاسی اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت بہت تفصیل طلب ہے، دوسری دعوت (اسلام) کے نمائندوں نے محض اپنی کمزوریوں کی بنا پر یورپ کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ ان کے اعلیٰ درجہ کے سرسبز اور اہم ممالک اُن کے ہاتھوں سے نکل کر یورپین قوموں کے قبضہ میں چلے گئے۔ ان کا عالمگیر سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔ سمندروں اور خشکی پر سے ان کا تفوق اُٹھ گیا۔ ان کی بین الاقوامی ساکھ جاتی رہی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کو تقریباً دنیا کے ہر حصہ میں اور خود اپنے ممالک میں بدترین قسم کی غلامی اور قومی ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے دماغ بھی مفتوح اور غلام ہونے لگے مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر حملہ کیا، مسلمانوں کے قومی اوصاف اور اخلاقی محاسن جو ان کی سلطنتوں اور شاداب ملکوں سے زیادہ بیش قیمت تھے ایک ایک کر کے مٹانے شروع کیے اور ان کی جگہ بدترین انسانی عیوب اور اخلاقی کمزوریاں جو بُت پرست یونان و روم اور تاریک یورپ اور ملحد نشاۃِ ثانیہ سے اس کے حصہ میں آئی تھیں اُن پر مسلط کر دیں۔ پھر انھوں نے ان مفتوحوں کے دین و ایمان پر حملے شروع کیے۔ ان کی دینی تعلیمات اور ان کے اصول و احکامِ شریعت کا استہزا کیا، ان کو لبسا اوقات تثلیث پرست اور بعض اوقات ملحد و بے دین بنانے کی کوشش کی اور ان میں خود بڑی حد تک میں ایک ایسی بااثر جماعت پیدا کر دی جو ان کے دین و تہذیب سے باغی تھی اور جو اندر اندر ان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش میں تھی۔ غرض فاتح نے مفتوح کو ہر طرح سے غیر مسلح، غیر منظم اور ناتواں کر دیا اور اس کے ہر سرمایہ اور ہر ملکیت کو تاوانِ جنگ یا مالِ غنیمت میں وصول کرنے کی کوشش کی۔ فاتح نے اپنی ذہانت اور دور بینی سے اس حقیقت کا پورے طور پر ادراک کیا کہ اس زمین کے اوپر مسلمانوں سے بڑھ کر اس کا کوئی حریف نہیں، اس لیے یا تو اس نے اس حریف کا سر کچلنے کی کوشش کی اور جہاں اس سے یہ نہ ہو سکا وہاں اس نے اس حریف کو اپنا مستقل حلیف اور بدرجہ مجبوری بے ضرر خادم بنانے کی کوشش کی۔

یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اس مکمل شکست، اس مغلوبیت و ذلت اور اس نقصانِ عظیم کا جو ان کو پہنچا طبعی و نفسیاتی اثر کیا ہونا چاہیے تھا؟ ہر صحیح الفطرت انسان کہے گا کہ مسلمانوں کے دل میں یورپ کی قوموں کی طرف سے سخت عناد اور جذبۂ انتقام پیدا ہونا چاہیے تھا، اور اُن کو بھی ان قوموں کو اپنا مستقل حریف حقیقی مدمقابل اور عالمگیر دشمن سمجھنا چاہیے تھا، اور اس کی کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ مقابل دعوت کی عالمگیر نمائندگی کی طاقت سے محروم ہو جائے، اس کا اقتدار اس حد تک ختم ہو جائے کہ اس کی تحریک و دعوت میں کوئی کشش اور کمزور انسانوں کے لیے کوئی کشمکش باقی نہ رہے اور دنیا میں دو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دعوتیں برابر کی باقی نہ رہیں بلکہ صرف ایک دعوت رہے اور وہ دعوت الی اللہ ہے،

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

یہاں تک کہ فتنہ (کفار کا غلبہ) باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے۔

ان کی دعا یہ ہونی چاہیے تھی:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ

اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو آرائش اور دولتیں بخش رکھی ہیں، اے ہمارے پروردگار (اس کا نتیجہ یہ ہے) کہ وہ تیرے راستہ سے لوگوں کو بھٹکائیں، اے ہمارے پروردگار ان کی دولتوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔

ان کو دنیا کے ہر حصہ میں یورپین تہذیب اور یورپین طاقت کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے تھا کہ وہ دنیا میں دعوتِ جاہلیت کی علمبردار ہے اور اس کی قوت کی وجہ سے دعوتِ الٰہی کو فروغ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہی عالمگیر مسئلہ ہونا چاہیے تھا اور ہر مسئلہ اسی مرکزی مسئلہ کا جز ہونا چاہیے تھا۔ ان کو ہر ملک میں اپنے کو دعوتِ اسلام کا عالمگیر نمائندہ سمجھنا چاہیے تھا اور ہر ملکی، قومی، سیاسی مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے تھا اور وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے تھا جو اس عالمگیر دعوت کے نمائندوں کو شایانِ شایان ہے۔ ان کو کوئی ایسا موقف اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا جس سے اس عالمگیر حریف اور اس جاہلی تحریک و دعوت کو کسی قسم کی تقویت و امداد حاصل ہو خواہ محدود ملکی مسائل اور وطنی و قومی مصالح کا تقاضا کچھ ہو۔ ان کو کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا جس سے اس نظام کی طرف ان کا میلان اور اس کے علمبرداروں کے ساتھ ان کا اتحاد و محبت ظاہر ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔

اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جنھوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تم کو بھی آگ لگ جائے گی اور اللہ کے مقابلہ میں تمھارا کوئی مددگار نہ ہوگا اور کسی طرف سے تمھیں مدد نہ مل سکے گی۔

لیکن کس قدر حیرت و تاسف کا مقام ہے (وہ تاسف و تحیر جو بقول حضرت علیؓ قلب کو مردہ، دماغ کو معطل، اور غموں اور فکروں کو بڑھا دیتا ہے) کہ یہ عظیم الشان حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے یہ مسئلہ اپنی اس مرکزیت اور عمومیت کے ساتھ ان کے ذہن سے صاف نکل گیا ہے۔ اپنی اور اپنے تاریخی اور مستقل عالمگیر حریف کی یہ صحیح پوزیشن اُن کی نظر سے بالکل مخفی ہے۔ دو سو برس کی خونچکاں تاریخ جو فتح و شکست اور واقعات و حوادث کا مرقع ہے ان کے حافظہ سے بالکل محو ہو گئی ہے۔ وہ اس حقیقتِ واقعی کو بالکل بھول گئے ہیں کہ وہ اور مغربی قومیں دو مقابل دعوتوں، دو متضاد نظامِ حیات، اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں، اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا اونچا ہوگا، ان میں سے ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود، ان کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لیے ایک مستقل مزاحمت، ایک مسلسل خطرہ اور ایک مستمر کشمکش ہے۔ اس امرِ واقعی کا اہلِ مغرب کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں۔ اس حقیقت کو قرآنِ حکیم نے کس صراحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ

اے ایمان لانے والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو اور دوستی کا اظہار کرتے ہو حالانکہ تمھارے پاس جو دینِ حق آ چکا ہے اس کے وہ منکر ہیں اور رسول اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو، جلا وطن کرتے ہیں۔ اگر تم میرے راستہ پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی کی طلب میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

أَعْلَنتُمْ ۚ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ إِن يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝ (ممتحنہ - ۱)

نکلے ہو تو ان سے تمھیں دوستی نہ رکھنی چاہیے۔ تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو حالانکہ مجھے ان سب چیزوں کا اچھی طرح علم ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہ راست سے بھٹکے گا۔ اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو وہ کھل کر تمھارے دشمن ہو جائیں اور تمھاری طرف برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں۔ وہ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ۔

اس موقع پر ایک مسلمان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے اور اس کے ایمان اور غیرتِ دینی کا تقاضا کیا ہے؟ اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہی آیت کے بعد کہا گیا :

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (ممتحنہ - ۱)

تمھارے لیے ابراہیمؑ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان میں عمدہ نمونہ ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو بیزار ہیں، ہم تمھارے منکر ہیں اور ہم میں تم میں عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اہلِ کفر کو تو اس فرق و اختلاف کا احساس ہو اور اپنے دین و مسلک کے لیے محبت و غیرت زیادہ ہو اور وہ اپنے مخالفین سے کبھی اتحاد و موالات کے لیے تیار نہ ہوں مگر اہلِ ایمان ذرا سی مصلحت سے ان کے ساتھ موالات کرنے لگیں۔ اس فرق کو بھی قرآن نے بیان کیا ہے :

هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ (آل عمران)

ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ ان سے محبت کرتے ہو مگر وہ تم سے قطعاً محبت نہیں رکھتے۔

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ

تم سے یہودی اور عیسائی اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ) جب تک تم ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جاؤ۔

اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہ سہی لیکن اجمالی طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اب سے کچھ مدت پہلے تک بے دین و لامذہب یورپ اور اس کی حیوانی تہذیب و نظام کے لیے نفرت موجود تھی "کافر فرنگی" نفرت و حقارت کے لیے ضرب المثل تھا۔ لیکن ہم کو اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہیے کہ اس چالیس برس کے عرصہ میں مغربی تعلیم و تہذیب نے بتدریج اس نفرت کو کم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ نفرت کے بجائے رغبت پیدا کر دی۔ اس تبدیلی کی پوری ایک تاریخ ہے۔ پہلے اس نے مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کیا، مغرب کا بالعموم تفوق ذہن پر قائم کیا، اس کا پورا نظام نہایت خوشنما اور آراستہ کر کے دکھایا، پھر اس کی محبت کو قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے اس سے انحراف مشکل ہو گیا، یہاں تک کہ سیاسی طور پر اگر اس کو اس سے اختلاف بھی ہو تو ذہنی اور تہذیبی حیثیت سے اس کا ربط اس سے قائم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمان کی ذہنیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ اس کو دنیا میں اگر اپنا کوئی حلیف اور سرپرست نظر آتا ہے تو وہ صرف یورپین طاقت۔ اس نے اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں جو روز روشن کی طرح ہے کہ اس کا اصلی اور عالمگیر حریف جس سے پہلی صدی ہجری سے اس چودھویں صدی ہجری تک مسلسل معرکہ آرائی رہی اور جو دنیا کی قیادت اور اس کی تعمیر نو میں اس کا اصلی رقیب اور مزاحم ہے وہ یورپ ہے۔ اس نے اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا کہ جب تک یورپ کا سیاسی اقتدار دنیا میں قائم ہے اس وقت تک دین کی دعوت پورے طور پر سرسبز نہیں ہو سکتی، اور اس میں وہ طاقت اور جذب و کشش نہیں پیدا ہو سکتی جس کی وہ مستحق ہے۔ جب تک یورپ تنہا دنیا کے لیے مقتدا اور پیشوا ہے اس وقت تک انسانی محاسن و فضائل اور اسلام کے معیار اخلاق کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام کی اور بالتبع انسانیت کی عین مصلحت یہ ہے کہ یورپ کو منصب قیادت سے معزول کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور چونکہ مسلمان ہی دنیا کے اخلاق اور صلاح و فساد کے ذمہ دار ہیں اور وہی دنیا کے محتسب ہیں اس لیے یورپ کو اس منصب سے ہٹانا تنہا ان ہی کا فریضہ ہے۔ اور یہ مسلمانوں ہی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منصب ہے کہ یورپ کو رہنمائی و سرداری کے مقام سے ہٹا کر دنیا کی زمام قیادت خود سنبھالیں۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمان مسائل پر اس نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کرتے اور ان کو اپنی صحیح حیثیت یاد ہی نہیں۔ وہ یورپ کو پورے طور پر بے نقاب ہو جانے کے بعد بھی پہچان نہیں سکے۔ ان کی نظر اب بھی محدود اور کوتاہ ہے۔ وہ قومی مصلحتوں اور محدود جغرافی مسائل میں اس عالمگیر ضرورت کو بھولے ہوئے ہیں اور وہ بہترین فرصت ضائع کر رہے ہیں جو تاریخ میں صدیوں میں پیش آتی ہے۔

(۳) مسلمانوں پر اس وقت ایک نظر ڈالنے سے ایک عام ذہنی و نفسی کیفیت نظر آتی ہے جسے پورے طور پر الفاظ میں ادا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن شاید قریب تر الفاظ یہ ہوں کہ "کچھ کیے بغیر سب کچھ پا جانے کی خواہش" گویا استعارہ کی زبان میں مسلمان بیٹھے بیٹھے شطرنج کی ایسی چال چلنا چاہتے ہیں کہ دفعۃً بازی مار لیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان سیاست میں دیر میں آئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے سیاست کا مفہوم محض انجمن آرائی، تجاویز کی منظوری، اظہار رائے اور زیادہ سے زیادہ اظہار ناراضگی سمجھا جس سیاست کی بنیاد آج سے ۳۰-۴۰ سال پہلے پڑی تھی اس کا مزاج اور خمیر تمام تر یہی تھا، بلکہ درحقیقت یورپ میں بھی اس وقت (جب انتخابی اور جمہوری زندگی کا آغاز تھا) سیاست کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ مگر اس کے بعد سے تمام دنیا کے حالات بہت سرعت کے ساتھ بدل گئے۔ اب سیاست نام جدوجہد اور ایثار و قربانی کا ہے۔ مگر مسلمانوں میں تبدیلی بہت دیر میں واقع ہوتی ہے، اور عجیب بات ہے کہ ان کا سب سے زیادہ بدلنے والا طبقہ سب سے کم بدلنے والا ہے اور سب سے زیادہ متحرک اور ترقی پسند جماعت سب سے زیادہ جامد اور ساکن واقع ہوئی ہے چنانچہ تحریک خلافت کے چند سالوں کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ محض جلسوں، تقریروں، تجاویز، بیانات، وفود، اور یادداشتوں (میمورنڈم) کی روداد ہے۔ انھوں نے مغربی سیاست کا جو سبق یاد رکھا ہے وہ صرف یہ کہ سیاست نام ہے دماغی ذہانت، قانونی قابلیت، سیاسی حاضر دماغی، اور حسن تقریر کا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ مجلسی (پارلیمنٹری) سیاست کے لیے تو مفید ہے مگر خارجی اور عملی سیاست اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلابی جدوجہد کچھ اور چاہتی ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔

اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتنی ذہنی پستی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ شماتت (دشمن کی مصیبت پر خوشی) پر اتر آئے ہیں۔ تربص دوائر (گردشِ زمانہ کا انتظار) ان کا شیوہ ہوگیا ہے۔ اخلاقی طاقت اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ وہ دوسروں کی جرأت وجاں بازی اور ایثار و قربانی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے اور اس کے ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ کوئی قوم کسی صحیح یا غلط مقصد کے لیے کوئی قربانی کر رہی ہے چہ جائیکہ ان میں اس سے اپنے صحیح اور بلند مقصد کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ صورتِ حال بھی تشویش کی باعث ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں پر اپنی کمزوری اور ناتوانی کا احساس اتنا طاری کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کو کسی جدوجہد اور قربانی کا اہل نہیں سمجھتے اور کسی قسم کے خطرات کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ انھوں نے یقین کر لیا ہے کہ مسلمان خربوزہ کی طرح ہیں جس کے لیے ہر حال میں خطرہ ہی خطرہ ہے، اس لیے نہ وہ چھری پر گرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ چھری کو اپنے اوپر گرنے دینا چاہتے ہیں۔ نیز اُن کو دوسری طاقت پر اعتماد کرنے کا ایسا عادی کر دیا گیا ہے کہ وہ خدا پر بھروسہ کرنے اور اعتماد علی النفس کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال وقتی اور عارضی نہیں ہے، اندیشہ ہے کہ کہیں ان حالات میں مسلمانوں کی مجاہدانہ روح اور ان کا جذبۂ سرفروشی ایک مدتِ طویل کے لیے سرد نہ ہو جائے اور وہ توکل علی اللہ اور پھر اعتماد علی النفس کے جوہر سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہ مسلمانوں کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی تلافی آسانی سے ممکن نہ ہوگی۔

مسلمانوں کی یہ اپنے آپ سے مایوسی اور اعتماد علی الغیر، اپنی کمزوری کا ضرورت سے زیادہ احساس اور دوسروں کی طاقت کا ضرورت سے زائد اندازہ، اور اقلیت واکثریت کے مسائل سے شب وروز کا یہ انہماک انگریزی تعلیم وتہذیب اور مغربی سیاست کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو ایک جامد قوم دیکھنے کی عادی ہے اور جو اعلاء کے طلسم سے کسی طرح نکل نہیں سکتی اور جو ایمان وتوکل کی دولت سے محروم ہے۔ اس زہر کا تریاق قرآن وحدیث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اشاعت ہے جب تک مسلمان کی سیاست قرآن وحدیث پر مبنی تھی اور اس کے دماغ و دل اور روح پر ان کا اثر تھا اس میں اتنا عزم و توکل اور خدا کے وعدوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس سے خارقِ عادت افعال صادر ہوتے تھے محمد بن قاسم فاتح سندھ اور طارق بن زیاد فاتح اندلس کے واقعات کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیت:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تمہیں بالا و برتر ہو اگر تم مومن ہو۔

اور

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

جن لوگوں کے سامنے رہتی تھی اور ان کا اس پر ایمان تھا انھوں نے مٹھی بھر جماعتوں سے ملکوں کو فتح کرلیا اور وہاں کی تہذیب، زبان اور معاشرت کو بالکل بدل دیا۔ آج بھی صرف قرآن وحدیث کی اشاعت ہی مسلمانوں میں اعتماد اور قلب کی طاقت پیدا کرسکتی ہے۔

صحابہ کرام اور مجاہدینِ اسلام کے حالات وواقعات کی اشاعت بھی اس نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے خصوصاً ماضی قریب کے عالی ہمت مجاہدین کے سوانح وحالات مثلاً حضرت سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل شہید، شیخ سنوسیؒ، محمد بن عبدالکریم ریفی، جنھوں نے قریب تر ماضی میں نہایت قلیل طاقت اور رفقاء کی بہت تھوڑی تعداد کے ساتھ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کیا اور ایمان کی طاقت اور عزم وتوکل کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ جو لوگ سیاسی تحریکوں سے ہٹ کر مسلمانوں میں تعمیری اور تعلیمی کام کررہے ہیں ان کو اس ضرورت کی طرف جلد متوجہ ہونا چاہیے کہ یہ مسلمانوں کی کسی سیاسی خدمت سے کم اہم کام نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کی سیاست کی صحیح بنیاد ہے اور اسی پر ان کے مستقبل کی تعمیر ہوگی۔

© rasailojaraid.com